۲۲ رجولائی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر آل احمد سرور | شمارہ ۲۸

اس شمارے میں

اداریہ

ترقی اردو بورڈ

وزارت تعلیم حکومت ہند نے اردو میں یونی ورسٹی کی پہلی ڈگری کے واسطے علمی کتابوں کی تیاری کے لئے جو ترقی اردو بورڈ بنایا ہے اس کے کام کی رفتار پچھلے سال خاصی سست رہی، مگر امسال اس میں تیزی آگئی ہے۔ علاوہ مضامین کے ماہرین کی کمیٹیوں کے، اصطلاح سازی کے لئے جو مختلف علوم کے ماہرین کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں ان کی کئی نشستیں ہو چکی ہیں۔ جون میں دہرہ دون میں دس دن کا ایک اجتماع ہوا جس میں اصطلاح سازی کا کام خاصا آگے بڑھا۔ اس کے بعد شروع جولائی میں جامعہ ملیہ میں چار دن کا ایک سیمینار ہوا جس میں دہلی کے جن مترجمین اور مصنفین نے شرکت کی ان کی تعداد پینتالیس تھی۔ اس سیمینار کے ابتدائی اجلاس کے بعد دو حصے ہو گئے ایک انسانی اور سماجی علوم کا، دوسرا بنیادی سائنسی علوم کا۔ دونوں حصوں میں ترجمے کے مسائل پر غور کیا گیا اور اس سلسلے میں مناسب سفارشات کی گئیں۔ اس کے بعد علی گڑھ میں ۱۲ رجولائی سے ۱۶ رجولائی تک علی گڑھ کے مصنفین اور مترجمین کا اجتماع ہوا۔ اس میں حاضری پچیس سے متجاوز تھی۔ یہاں بھی تراجم اور تصانیف کے مسائل پر غور کیا گیا اور دہلی کے سیمینار کی سفارشات بھی سامنے رہیں۔ انسانی علوم، سماجی علوم اور سائنسی علوم کے ماہرین شریک تھے۔ دونوں حصوں میں ترجمے کے نمونے بھی پیش کئے گئے جن پر شرکا نے کھل کر بحث کی۔ علی گڑھ کے سیمینار نے بھی تراجم اور تصانیف کے سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کر دی ہیں جن پر بورڈ کی مجلس عاملہ کے آئندہ جلسے میں غور ہوگا۔

پروفیسر مجیب نائب صدر بورڈ کے کاموں پر خاصا وقت صرف کر رہے ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ کے سیمینار میں بتایا کہ چھ سو کے قریب کتابوں کی تصنیف یا ترجمے کا کام مختلف لوگوں کے سپرد کر دیا گیا ہے، تیس مسودے نظر ثانی کے بعد پریس کے لئے تیار ہیں۔ اصطلاح سازی کا کام اب تیزی سے ہو رہا ہے اور قوی امید ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء تک یہ ختم ہو جائے گا۔ تراجم اور تصانیف کے مسائل پر غور کرنے کے لئے حیدر آباد، لکھنؤ اور پٹنہ میں تین سیمینار اور ہوں گے، جہاں مقامی حضرات اپنے مسائل پر غور کریں گے۔ اس کے علاوہ اصطلاح سازی کے لئے جے پور میں مختلف کمیٹیوں کا ایک اجتماع بھی ہونے والا ہے۔ علی گڑھ میں ترقی اردو بورڈ کا ایک چھوٹا دفتر قائم ہو گیا ہے تاکہ علی گڑھ کے لوگوں کے کام کی نگرانی بھی ہو سکے اور ان کی ان دشواریوں کو بھی دور کیا جا سکے جو کام کے دوران پیش آتی ہیں ایسا ہی

ایک چھوٹا دفتر حیدرآباد میں بھی قائم کیا جائے گا۔ علی گڑھ کے سیمینار میں جو سفارشات کی گئی ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ نومبر میں ایک ورکشاپ ہو جس میں تراجم کے نمونوں پر سیر حاصل بحث کی جائے، تاکہ مختلف ترجموں کے کام میں یکساں اصول پیش نظر رہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ایسے ورکشاپ اور جگہوں پر بھی کئے جائیں گے۔

۷۷-۱۹۷۶ء کے لئے ترقی اردو بورڈ نے ۲۵ لاکھ کا بجٹ بنایا ہے۔ مجلس عاملہ نے یہ طے کر دیا ہے کہ دفتر کے اخراجات کسی طرح پانچ فیصدی سے زیادہ نہ ہوں۔ اس لئے بجٹ کا بڑا حصہ کتابوں کی تیاری، مصنفین، مترجمین کے معاوضے اور پریس کے اخراجات پر صرف ہوگا۔ ایک معتد بہ رقم سیمیناروں، کانفرنسوں اور مختلف کمیٹیوں کے جلسوں پر صرف ہوگی۔ دفتر کے اخراجات سوا لاکھ سے زیادہ نہ ہوں گے۔ یہ احتیاط ہر طرح مناسب ہے۔

اب یہ امید بندھتی ہے کہ تیار شدہ مسودوں کی طباعت کا کام بھی جلد شروع ہو جائے گا اور اگلے سال تک خاصی تعداد میں کتابیں شائع ہو جائیں گی۔

ترقی اردو بورڈ کا کام نہایت اہم ہے۔ تمام اردو دوست چاہتے ہیں کہ ابتدائی منزل سے لے کر یونیورسٹی کی منزل تک کی تمام مضامین کی کتابیں عام طور سے مل سکیں۔ اب ضرورت یہ ہے کہ اردو دوست اپنی اپنی ریاستوں میں اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے سلسلے کو مضبوط اور مستحکم کریں اور اس سے آگے بڑھ کر اردو کالج کھولنے کی سوچیں۔ حیدرآباد میں تو ایک کالج کام کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ بڑھنا چاہئے۔ ان کالجوں کو اپنے حلقے میں لینے کے لئے شمالی ہند اور جنوبی ہند میں کم سے کم دو اردو یونیورسٹیوں کی ضرورت ہوگی جن کے لئے ابھی سے تیاری کرنا چاہئے اور اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور کشمیر یونی ورسٹی کو آمادہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے یہاں انگریزی کے علاوہ اردو کو بھی تعلیم کا ذریعہ اور امتحان کا ذریعہ بنائیں۔ عثمانیہ یونی ورسٹی نے تو اس کی اجازت دے دی ہے کہ اردو کے ذریعہ سے تعلیم پانے والے اس کا بی۔ اے کا امتحان دے سکتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بی۔ اے میں اردو اور ہندی میں امتحان کے پرچوں کے جوابات لکھنے کی اجازت تو دے دی ہے مگر اسے اردو میں تعلیم کا بھی جلد انتظام کرنا چاہئے۔

ترقی اردو بورڈ کے کاموں میں ابھی اور تیزی کی ضرورت ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اب کام پہلے سے بہت بہتر طریقے پر ہو رہا ہے۔ اردو دوستوں کا فرض ہے کہ اس کام میں تعاون کریں۔ کام کو بہتر بنانے کے لئے مشورے دیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صرف حکومت یا چند متعلقہ حضرات کا کام ہے بلکہ اسے اپنا کام سمجھیں اور اس میں پورا تعاون کریں۔ بعض حلقوں سے صرف اعتراضات کی لے ہی بلند ہوتی ہے۔ اعتراض کرنا بہت آسان ہے۔ کام کرنا مشکل۔ ہمیں خود کام کرنے، دوسروں سے کام لینے اور کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرنے کی بھی عادت ڈالنا چاہئے۔ اس سے سبھی کا بھلا ہوگا۔

(صفحہ ۱ سے آگے)

یہاں پایانِ کار جو اقدارِ زندگی پائی جاتی ہیں وہ عیسوی ہیں لیکن وہ مفروضہ نہیں ہیں بلکہ نمایاں ہوتی ہیں انکشاف تجسس اور تجزیے کے عمل سے گزرنے کے بعد۔ المیہ کارناموں میں یہ عمل زیادہ گہرا اور آزمائش میں ڈالنے والا ہے، طربیہ کارناموں اور رومانوں میں کسی قدر کم۔ لیکن بالآخر ہم جن اقدار سے دوچار ہوتے اور جنھیں عزیز رکھتے ہیں، وہ ہیں مذہبی اقدار ہی۔

شیکسپیئر کے ڈراموں میں جو اہم مذہبی یا عیسوی تصورات ہیں وہ ہیں گناہ اور ترغیب گناہ، سزا اور جزا کا نظام، جہنم برزخ اور بہشت، شیطان اور ملائکہ میں یقین، عقوبت اور صبر و استقلال، انصاف اور عفو و درگذر کے درمیان توازن، خودشناسی اور خود آگاہی کا حصول، نفرت پر محبت اور ترحم کی جیت، ندامت کا احساس، خدا کی برتری، جباری اور غفوریت اور زمانے اور ابدیت کا آپس میں تعلق، حضرت عیسیٰ کی قربانی اور کفارے (ATONEMENT) کی مثال، مادی زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں کے باوجود ان کی محدودیت کا شعور اور حیات بالبعد کے سکون و اطمینان سے اس کا مقابلہ اور روح کی لافانیت۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تصورات محض تجرید کی حیثیت سے سامنے نہیں آتے کیونکہ ہم ہمہ وقت کرداروں کے حرکت و عمل کے تماشے میں محو رہتے ہیں، لیکن یہ حرکت و عمل، یہ کشمکش اور تناؤ، یہ حیرت و مسرت، یہ امید و بیم کے سلسلے، غیر عقلی، مبہم یا مضحک نہیں ہیں۔ دلکش روشن اور متواتر و مسلسل حکایات کے ذریعے جن اقدار حیات تک ہماری رسائی ہوتی ہے وہ عالمگیر مذہبی اقدار ہی ہیں۔

حنیف کیفی بریلوی

اردو سانٹوں کا سب سے پہلا مجموعہ

اردو کا سب سے پہلا سانٹ اختر جوناگڑھی نے لکھا لیکن اردو سانٹ کی ایجاد کا سہرا اختر شیرانی کے سر باندھا جاتا ہے۔ اختر شیرانی کے متعلق یہ غلط فہمی اردو سانٹ کی ایجاد کے ہی سلسلے میں نہیں۔ عام طور پر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اختر شیرانی کی "شعرستان" (شائع کردہ اردو اکیڈمی پنجاب، بھاٹی دروازہ لاہور، دسمبر ۱۹۴۱ء) اردو سانٹوں کا سب سے پہلا مجموعہ ہے۔ یہ تصور کچھ تو غلط فہمی اور کچھ "اختر نوازی" پر مبنی ہے۔ عام غلط فہمی کی بنیاد غالباً کتاب کی یہ سرخی ہے۔ "شعرستان — اختر شیرانی کا جدید طرز کا کلام (سانیٹ)" اور اختر نوازی حکیم یوسف حسن، مدیر "نیرنگِ خیال" لاہور کی مندرجہ ذیل عبارت سے مترشح ہوتی ہے۔ "سانیٹ حضرت اختر شیرانی کی ایجاد ہے۔ حضرت اختر شیرانی نے تقریباً پچیس سانیٹ لکھے ہیں لیکن ان کے منشا کے مطابق ان کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے۔"

یہ عبارت حکیم صاحب نے اختر شیرانی کی اس عنایت کے جواب میں "ہدیۂ تشکر" کے تحت سپرد قلم کی ہے جو انھوں نے حکیم صاحب کو "نیرنگِ خیال" کی اعانت کے سلسلے میں "اپنے ۲۰ سانیٹ ایک کتاب کی صورت میں شائع کرنے کے حقوق دے کر کی ہے۔ حکیم صاحب نے سانیٹ کو اختر شیرانی کی ایجاد قرار دیتے ہوئے ان کے اس وقت تک نظم کئے گئے سانٹوں کی تعداد بھی بتا دی اور اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ اس کتاب میں ان سانٹوں کا "انتخاب شائع کیا جا رہا ہے" لیکن کسی مصلحت کے پیش نظر انھوں نے اس حقیقت کا اظہار مناسب نہیں سمجھا جسے فیض احمد فیض نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "اس مجموعہ میں کچھ سانیٹ ہیں اور چند سانیٹ نما نظمیں[1]"۔ اور ہمارے اربابِ نظر نے بھی فیض کے اس واضح اشارے کے باوجود اس بات کی ضرورت نہ سمجھی کہ اس مجموعہ کو سانٹوں کا مجموعہ قرار دیتے وقت اس میں شامل نظموں کو سانیٹ کی تکنیک کی کسوٹی پر پرکھتے اور سانٹوں کو دیگر نظموں سے علیحدہ کرتے۔ دراصل "شعرستان" کو سانٹوں کا مجموعہ کہنا ہی غلط ہے۔ ساٹھ صفحات کی اس کتاب میں اختر شیرانی کے صرف تیرہ سانٹ ہیں جو چھبیس صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کے ساتھ الگ الگ طرز کی چار دیگر نظمیں بھی اس میں شامل ہیں، جن کے صفحات کی تعداد سانٹوں کے صفحات کی تعداد کے مساوی ہے۔ باقی آٹھ صفحات پیش لفظ وغیرہ کے حصہ میں آتے ہیں۔ مذکورہ بالا چار نظموں میں سے ایک نظم "عصمتِ شباب" جو اس مجموعہ کی آخری نظم ہے، بیس بندوں پر مشتمل ہے اور کتاب کے سولہ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔

"شعرستان" کی نظموں کے اس تجزیہ کے بعد بڑی آسانی کے ساتھ اور بلا کسی جھجک کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دیگر نظموں کے ساتھ صرف تیرہ[2] سانٹوں کے اس انتخاب کو "سانٹوں کا مجموعہ" کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اسے صرف اختر شیرانی کے جدید طرز کے کلام کا انتخاب کہنا چاہیے۔

"شعرستان" کی اشاعت کے بائیس سال بعد ۱۹۶۳ء میں

مترجم برہم ناتھ دت

رگوید

۸ — ۲۴ — ۱۳

اے خدا! ہے ذات تیری سب سے بالاتر نشیں
سب سے اعلیٰ ہے تو اے خلاقِ عالم آفریں
کیجیے ہم کو عطا انعام اوصافِ حسیں

یا الٰہی! سب گناہوں کا ہے تو آمرزگار
علم کے اصناف کا ہم کو بنا سرمایہ دار
جہل سے محفوظ رکھ جو ہے گناہِ بدتریں

اے کریم! اے کارساز! اے منصف و عادل خدا!
پرورش کرتا ہے تو آفاق کی صبح و مسا
دور رکھیو دل کے آئینے سے رنگِ بغض و کیں

علم و صبر و حوصلہ دے اے خدائے مہرباں!
ہمت و مستی و مال و جاہ سے کر کامراں
کشورِ تاب و تجلی کو بنا زیرِ نگیں

ہے تری سرکار میں یارب یہ اپنی التجا!
سب سے بڑھ کر نیک تر، خوشحال تر ہم کو بنا
رکھ ہمیں دنیا میں عزت اور صحت کے قریں

---

[1] فیض احمد فیض، پیش لفظ "شعرستان" ص ۲

[2] ان سانٹوں میں سے نو سانٹ ماہنامہ "نیرنگِ خیال" بابت ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکے تھے۔

عزیز تمنائی کے سانٹوں کا مجموعہ "برگِ نوخیز" شائع ہوا۔ اسے بھی اردو زبان میں سانیٹ کا پہلا مجموعہ کہہ کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ بھی خوش فہمی اور اردو سانٹ کے ارتقاء سے لاعلمی کا مظہر ہے۔ حقیقت جو اب تک پردۂ راز میں رہی یہ ہے کہ اردو شاعری میں سانٹوں کا سب سے پہلا مجموعہ ہونے کا فخر شائق وارثی بریلوی کے "نغمات" کو ہے جو ۱۹۴۲ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا۔

اختر شیرانی اور ن۔ م۔ راشد کے زمانے میں جسے اردو سانٹ کا دورِ شباب کہا جا سکتا ہے سانٹ نگاری کے آسمان پر شائق وارثی کا ظہور ایک ایسے تنہا ستارے کے روپ میں ہوا جس کی چمک دمک سب سے علیحدہ تھی۔ اس کی روشنی میں خیرگی تو نہ تھی، البتہ اس میں بڑی ٹھنڈک تھی۔ اس کے جمال میں شوخی اور بھڑک تو نہ تھی مگر اس کی سادگی بڑی پیاری تھی۔ وہ علیحدہ ایک گوشے سے روشنی کی شعاعیں بکھیرتا رہا لیکن اس کی آب و تاب پر کسی کی نظر نہ گئی اور بہت جلد یہ روشن ستارہ تاریکیوں میں گم ہو گیا۔ شائق وارثی ایک اعلیٰ اور کامیاب سانٹ نگار ہوتے ہوئے بھی آج غیر معروف اور گمنام ہے۔ یہاں تک کہ آج اس کے ہم وطن بھی اسے اور اس کی شاعری کو بھولے ہوئے ہیں اور اس کی سانٹ نگاری سے تو چند قریبی دوستوں کے علاوہ کوئی بھی واقف نہیں۔

اشفاق علی خاں شائق وارثی کا وطن بریلی (یو۔پی) ہے، گو خود ان کی پیدائش بریلی سے باہر ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش (اسکول کے ریکارڈ کے مطابق) ۱۰ جولائی ۱۹۱۵ء ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ایچ۔ آئی۔ ایم۔ ہائی اسکول (موجودہ آزاد انٹر کالج) بریلی سے ہائی اسکول پاس کیا۔ بریلی کالج، بریلی سے ۱۹۴۰ء میں بی۔اے کرنے کے بعد ایم۔ای۔ایس۔ میں ملازمت اختیار کی کچھ عرصہ بعد لکھنؤ تبادلہ ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہیں سے پاکستان چلے گئے۔ آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ نویں جماعت سے شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ بعد میں گیت اور سانٹ بھی لکھے۔ غزلوں اور گیتوں کے مجموعے بھی علیحدہ علیحدہ صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں رہائش اختیار کرنے کے بعد شاید شاعری سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

"نغمات" کی اشاعت ثانی کی نوبت نہیں آئی۔ شائق وارثی اور ان کے سانٹوں کی عدم مقبولیت کی وجہ شاعرانہ محاسن کی کمی نہیں بلکہ اس کے کچھ اور اسباب ہیں جن پر اظہار خیال کرنا ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ "نغمات" نہ صرف اردو میں سانٹوں کا پہلا مجموعہ ہے بلکہ اسے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کا کوئی بھی سانٹ اردو کی خود ساختہ شکلوں میں نہیں ہے۔ اس مجموعہ میں باون سانٹ ہیں جن میں صرف تین سانٹ پٹرارکی (PETRARCHAN) طرز پر ہیں باقی تمام سانٹ شیکسپیری (SHAKESPEARIAN) فارم میں لکھے گئے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ترتیب قوافی کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ اصل کے مطابق سانٹ لکھنے کی اردو میں سب سے پہلی مستقل کوشش ہے اور یہ کوشش بہت کامیاب ہے۔ اس مجموعہ کے کچھ سانٹ اس سے پہلے "بریلی کالج میگزین" کے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کے شماروں میں شائع ہوتے رہے تھے۔

"نغمات" کے سانٹوں کو تین عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۔ مشاہدات	۱۶ سانٹ
۲۔ واردات	۳۱ سانٹ
۳۔ اخلاقیات	۵ سانٹ

اس کے ساتھ یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ ہر سہ عنوانات کے تحت کسی مشہور انگریزی شاعر یا ادیب کا کوئی قول درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ سانٹوں میں عنوان کے نیچے انگریزی نظموں کا وہ حصہ نقل کیا گیا ہے جو اس مخصوص سانٹ کا جذبۂ محرک (MOTIF) ہے یا جس کی وضاحت اس میں کی گئی ہے۔

"درسِ اخلاق" جوانی دیوانی کے مزاج سے میل نہیں کھاتا اور ایک طالب علم کے معیار سے بلند ہے۔ شاید اسی لئے "اخلاقیات" کے تحت جو سانٹ دیے گئے ہیں ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ پانچ میں سے چار سانٹ انگریزی شعراء کے کسی خیال کی وضاحت کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ روایتی مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ خاص طور سے اس مضمون کی تکرار ہے کہ کائنات ایک "فریبِ مسلسل" ہے، دنیا سرائے فانی ہے، عالمِ ہستی "سراب گاہ و مصیبت سرا" ہے۔ اس سے دل لگانا سراسر نادانی ہے۔

پیش پا افتادہ مضامین جو روایتی طور پر نظم کر دیے گئے ہیں شائق کا میدان نہیں۔ ان سے ان کی شاعری کا رنگ اور سانٹ نگاری کی خصوصیات نمایاں نہیں ہوتیں۔ ان کا اصل جوہر ان سانٹوں میں نظر آتا ہے جو "مشاہدات" اور "واردات" کے تحت آتے ہیں۔ ان سانٹوں کی حسین فضا اور پر کیف ماحول ایک جوان طالب علم کی سرمستیوں کی صحیح ترجمان ہیں۔ اس طالب علم کی تعریف وہ یوں کرتے ہیں۔

مرکزِ حیات ہے نا آشنائے رنج و ملال
خود میں عیش و مسرت سے ہے ہم آغوش

. . . .

۵ سانٹ کی مختلف ہیئتوں اور ان کی فنی خصوصیات کے لئے ملاحظہ فرمائیے راقم الحروف کا مضمون "سانٹ ـ تعارف و تجزیہ" مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی، اکتوبر ۱۹۶۱ء۔

مری حیات پہ کرتا ہے رشک اک عالم
مرے خیال سے ہے دور دورِ مستقبل
فنا کا ڈر ہے نہ دنیا کی آفتوں کا غم
کہ انقلابِ جہاں کا بھی میں نہیں قائل

(طالب علم)

یہ بے فکرا نوجوان، بیؔ نا آشنائے رنج و ملال "طالب علم" جو دس عیش و مسرت "سے ہم آغوش" ہونے کے لئے دنیا کے حسین نظاروں کی سیر میں مست ہے۔ محبت اس کی زندگی ہے۔ اس کی محبوبہ اس کی دولت دنیا ہے۔ اس کی منظور نظر کا حسنِ شاداب اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے۔ اس کی نازک ادائیں اس کے جذبات و احساسات میں تحریک پیدا کرتی ہیں اور ان جذبات و احساسات کو شاعر بڑے خلوص و صداقت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ ان کی سچائی اور سادگی میں ایسی لطافت ہے کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ ایک رنگین اور پرکیف سماں ہماری روح پر طاری ہو جاتا ہے۔ حسین محاکات، جنھیں کہیں کہیں لطیف تشبیہات سے اور زیادہ رنگین بنا دیا گیا ہے، فردوسِ نگاہ بن جاتے ہیں۔ مشاہدات میں کہیں بھی فلسفی بننے اور نظارہ ہائے دنیا سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہاں شاعر ورڈسورتھ کی طرح آئینہ مجاز میں حسنِ حقیقت کا جلوہ نہیں دیکھتا، نہ کیٹس کی طرح حسن کا رشتہ صداقت سے جوڑتا ہے۔ یہاں شاعر نیرنگِ جلوہ کا شاہدِ محض ہے۔ یہاں شائق دنیا کے حسین نظاروں کا صرف شائق ہے۔ یہ نظارے بھی انگریزی کے رومانی شعراء کے دل پسند دیہی مناظر نہیں ہیں بلکہ شاعر چونکہ خود شہری زندگی کا پروردہ ہے، اس لئے اس کی نگاہوں کا مرکز بھی شہر کے نظارے ہی ہیں۔ یہاں رومانی شعراء کے دریاؤں، کھیتوں اور سبزہ زاروں کے بجائے تالاب، باغ، پارک، اور گھنے اونچے درخت نظر آتے ہیں۔ یہاں گاؤں کی الھڑ دوشیزہ کی سادہ اداؤں کے بجائے شہر کی اس "غزالیں آنکھوں والی" "زلف بدوش نازنین" کی شوخ طرازیاں فتنہ انگیزیاں نظر آتی ہیں جو جدید فیشن کے تمام ساز و سامان سے مرصع ہے جس کے رخ پر "رنگین غازہ"، "آنکھوں پر نازک سی عینک"، "سیمیں کلائی" پر "زریں گھڑی" اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ یہ

حسن و ادا کا اعلیٰ پیکر اور قیامت خود آرائی

. . . .

جوبلی باغ میں وہ اٹھلاتی شام کو ہے ہر روز آجاتی

(جوبلی باغ میں)

ان سانٹوں میں شاعر نے ہماری نظر کے سامنے وہی پیش کیا ہے جو خود اس کی نظروں نے دیکھا ہے۔ یہ غیر مصنوعی صداقت بڑی قابل قدر ہے۔ مقامی رنگ نے منظر نگاری میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔ وہ بڑے حسین انداز سے بریلی کے ایک تالاب کا منظر پیش کرتے ہیں "جو آبادی سے کچھ دور واقع ہے۔ اس تالاب کی شکل بالکل آنکھ کی طرح ہے اور اس کے کنارے خوشنما پیڑ پلک کی قطار ہے" یہ آنکھ کی شکل کا تالاب اب صفحۂ ہستی پر نہیں رہا لیکن صفحۂ قرطاس پر اس حسین انداز سے آج بھی دعوتِ نظر دے رہا ہے۔

ایستادہ ہیں کنارِ آب یوں کچھ نونہال
ڈبڈبائی آنکھ پر گویا ہے پلکوں کی قطار
اس طرح شاخوں کا شاخوں سے ہوا ہے اتصال
وقتِ رخصت مجھ سے وہ جیسے ہوئے تھے ہمکنار
سبزۂ نوخیز خمیدہ ہو گیا ہے آس پاس
گویا ابرو میں کسی کمسن کے بل کھائے ہوئے
اس طرح پانی میں پھیلی ہے شکن آلود گھاس
جیسے وقتِ غسل گیسو ان کے بکھرائے ہوئے

. . . .

آم کے اونچے درختوں میں چھپا تالاب ہے
یا حسین فطرت کا نشانیۂ ایک دلکش باب ہے

(تالاب)

منظر نگاری کی یہ ایک کامیاب مثال ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے تالاب کا حسین منظر رقص کرنے لگتا ہے۔ ساتھ ہی محاکات میں اچھوتی تشبیہات کی آمیزش سے ایک حسین و جمیل دوشیزہ کا دلفریب پیکر پس منظر میں ابھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہی حسن کاری "بھوپال تال" کے بیان میں نظر آتی ہے۔ مقامی رنگ اس میں کافی نمایاں ہے۔

سامنے ذی شان منٹو ہال اور وقتِ سحر
یہ شکستہ ساحل آئینۂ عہدِ قدیم
یہ چٹانیں سرخ و نا ہموار تا حدِ نظر
اور ان پر یہ عمارت ہائے خوش رنگ و عظیم
یہ نظر افروز منظر اور یہ "بھوپال تال"
حسن کا چاروں طرف پھیلا ہوا ہے ایک جال

(بھوپال تال)

"شاعرانہ مصوری" یا "مصورانہ شاعری" کی ایک کامیاب مثال سانٹ "میرے سامنے" میں بھی ملتی ہے، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بریلی کے کمپنی باغ میں شاعر کے سامنے اس کی محبوبہ بڑے دلکش انداز میں بیٹھی ہوئی اس کے اشعار لکھ رہی ہے اور اپنی نازک ادائی سے شام کی رنگینی اور منظر کی کیف انگیزی میں اضافہ کر رہی ہے

گھاس پر بیٹھی ہیں وہ میری نظر کے سامنے
نوٹ بک گھٹنے پہ ہے دستِ نگاریں میں قلم
اور گردن کو جھکائے اک ادائے خاص سے
کر رہی ہیں میرے پر جذبات شعروں کو رقم

. . . .

گھاس پر رکھ کر قلم انگڑائی لینا ناز سے
اور پھر شرما کے رہ جانا وہ تجھ کو دیکھ کر
خود بخود پھر گنگنا اٹھنا عجب انداز سے
وہ ترنم کی پھواریں وادیٔ احساس پر
ایسے عالم میں کون ہے جو اپنے دل پر قابو رکھ سکتا ہے!
یہ فضا یہ وقت اور یہ فرصتِ نظارگی
آرزو بیخود ہوئی جاتی ہے چشمِ شوق کی

(میرے سامنے)

کتنی پیاری تصویر ہے اور کتنی سادگی سے کھینچ دی گئی ہے! پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہی شاعر کا کمال ہے وہ اپنی تخلیق کردہ دنیا کا منظر اس طرح ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ ہم اتنی دیر خود کو اسی فضا میں سیر کرتے ہوئے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ حقیقت پر مبنی سادہ مگر دلکش تخیلات "واردات" کے تحت شامل ہونے والے کچھ سانٹوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ جیسے

مولسریوں کے تلے بیٹھی ہوئی
کر رہی ہیں آج میرا انتظار
دیکھنے والوں سے شرمائی ہوئی
چونکتی ہیں آہٹوں سے بار بار

. . . .

شوق بے پایاں نگاہوں سے عیاں
اور چہرے سے نمایاں انکسار
احترامِ عشق ہے دل میں نہاں
خامشی پیرایۂ عرضِ وقار

(انتظار)

یا

وہ بزمِ ناز میں تری شوخی بصد حجاب
معصوم وہ فریب وہ تیری شرارتیں
وہ ارتباطِ خاص وہ اندازِ اجتناب
دیوار و در پہ چھائی ہوئی سی وہ حیرتیں

(یادِ ماضی)

کیف و نشاط کی فضا جو "مشاہدات" کے سانٹوں کی روح ہے "واردات" کے سانٹوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں غم کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آجاتی ہے لیکن یہ عام طور پر ان سانٹوں میں ہے جو کسی انگریزی نظم کے کسی خیال کی ترجمانی کے طور پر لکھے گئے ہیں ورنہ عام طور پر ان کی فضا نشاط انگیز اور کیف پرور ہے۔ اس کیف و نشاط کی بخشندہ محبوب کی ذات ہے جس کی بے لوث خالص اور لاشریک محبت شاعر کا ایمان ہے۔ اس کے جلووں کے سامنے شاعر کی نظر میں "دنیائے آب و رنگ" کے نظارے ہیچ ہیں۔

تیرے سوا کسی کی تمنا نہیں مجھے
میری نظر میں ہیچ ہے دنیائے آب و رنگ
کیفِ نوا و نغمۂ خوش آتا نہیں مجھے
تو ہی ہے میرے واسطے لیلائے شوخ و شنگ

ہر لغزشِ قدم ہے تری کیف آفریں
سرمستیوں میں غرق ہے ہر جنبشِ نظر
تیرے سوا نہیں ہے کوئی دل میں جاگزیں
تیرا ہی ذکر صبح و مسا ہے زباں پر

(فردوسِ محبت)

محبوب کی نوازشوں اور اس کے حسن کی رنگینیوں نے ہی شاعر کے اشعار کو کیف آگیں بنایا ہے اور ان کے ایک ایک لفظ میں شعریت بھر دی ہے۔ اس "احسان" کے بدلے میں شاعر اپنے اشعار میں اپنے محبوب کا حسین و جمیل تذکرہ کر کے اسے بقائے دوام بخش دیتا ہے "عطائے باہمی" کا یہ عمل اور ردِ عمل شاعر کی زبان میں ملاحظہ فرمایئے۔

مرے اشعار نے تم کو حیاتِ جاوداں بخشی
تمہارے حسن نے مجھ کو عطا فرمائی کیفیت
محبت نے مرے ہر لفظ میں اک شعریت بھر دی
مجھے حسن و محبت نے بنایا شاعرِ فطرت

. . . .

انھیں اشعار نے دونوں کو وہ کیفیتیں بخشیں
سبب ہیں جو تمہارے اور مرے مشہور ہونے کا
مرے اشعار تم سے ہے اور مرے اشعار سے تم ہو
کبھی ان کو فنا ہونا نہ ہونا ہے کبھی تم کو

(مرے اشعار)

شاعر کے محبوب کی شخصیت کا تعین چاہے نہ ہو سکے لیکن اس کا جو واضح نقشہ شاعر نے ان سانٹوں میں پیش کیا ہے اور اپنے حسنِ بیان سے اس نقشے میں جو دلکش رنگ اس نے بھرا ہے اس کی بنا پر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں محسوس ہوتا کہ ان نظموں کے ذریعہ وہ واقعی زندۂ جاوید ہو گیا ہے یہ سانٹ عہدِ ایلزبتھ کے سانٹ نگاروں کی اس روشِ عام کی یاد دلاتا ہے جس کے تحت وہ اپنے اشعار کے ذریعہ اپنے محبوب کو حیاتِ دوام عطا کرنے کا یقین دلاتے تھے۔

"واردات" کے آخری سانٹ کا انداز ان سانٹوں سے مختلف ہے۔ اس میں عاشق و معشوق کی جذبات خیز اور ہیجانی محبت کے بجائے میاں بیوی کی سادہ اور متوازن محبت پیش کی گئی ہے۔ محاذ پر لڑائی پر جانے والا ایک سپاہی اپنی غمزدہ شریکِ حیات کو صبر کی تلقین کرتا ہے تاکہ اس کی منزلیں آسان ہو جائیں۔

تمہیں ہے خوشی یہ کرو آج ظاہر　　نہ خود اشکبار ہو نہ مجھ کو رلاؤ
ذرا مسکراؤ ہنسو میری خاطر　　مجھے تم نہ اس وقت بزدل بناؤ

دعا مانگو ہم کو خدا پھر ملائے محبت کی ویران دنیا بسائے
(جدائی پر جاتے ہوئے ۔ اپنی شریک زندگی سے)

اس سانٹ سے دوسری جنگ عظیم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کی بدولت محبت بھرے دلوں کی جدائی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اسی طرح "طالب علم"، "رقاصہ"، "مضطرب" جیسے سانٹ بھی اس ذیل کے دوسرے سانٹوں سے مختلف فضا پیش کرتے ہیں۔ دو سانٹ "معیارِ عشق" اور "میری بزم خلوت میں بھی آ" معرفت اور حسن حقیقی کی محبت کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ دو سانٹ اردو غزل میں تصوف و معرفت کی روایات کے زیر اثر لکھے گئے ہیں یا واقعی شاعر عشق مجازی کی منزلوں سے گزر کر عشق حقیقی تک پہنچا تھا جس کی طرف "معیارِ عشق" کی ترتیب سے دھیان جاتا ہے۔ یہ سانٹ "واردات" کی ذیل میں آنے والے سانٹوں میں آخری دو سانٹوں سے پہلے واقع ہے۔ بہر حال ان چند سانٹوں کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر کیا گیا، ایک دو سانٹ چھوڑ کر "واردات" کے تمام سانٹوں میں اور "مشاہدات" کے ان سانٹوں میں، جن میں محبوب کے حسن و جمال کا بیان اور اس کے نظارے سے لطف اندوزی کا اظہار کیا گیا ہے، ایک باہمی ربط پایا جاتا ہے۔ یہ ربط داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ داخلی ربط ان میں حسن و عشق کے موضوع کی کارفرمائی سے ظاہر ہے اور خارجی ربط اس انداز بیان سے مترشح ہے جس میں ایک خاص قسم کی روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ اگر ان سانٹوں کو سلسلہ وار ترتیب دیا جائے تو اس سے ایک واضح داستان محبت مرتب ہو سکتی ہے، جس میں عاشق و معشوق کے کرداروں کی نمایاں خصوصیات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس باہمی ربط کی مثال اردو سانٹوں میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اردو سانٹ نگاری میں یہ ایک بالکل نیا انداز ہے جس میں کوئی شائق وارثی کا شریک نہیں۔

اسی طرح "نغمات" کے سانٹوں کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ اردو سانٹ نگاری میں منظری شاعری (NATURE POETRY) کی جس کی اردو شاعری میں بھی عام طور پر کمی ہے، واحد مثال ہے۔

"نغمات" کے سانٹ شائق پر جوش ملیح آبادی اور حسرت موہانی کے مخلوط اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اول الذکر کے اثر کی پرچھائیاں مختلف مناظر کی تصویر کشی میں نظر آتی ہیں اور موخر الذکر کا اثر محبوب کے حسن و جمال اور اس کی اداؤں کے بیان سے کسی قدر ظاہر ہوتا ہے۔ "میری بزم خلوت میں بھی آ" میں اقبال کے رنگ کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔

"نغمات" کے سانٹوں میں اگرچہ گہرائی نہیں اور اس کا مطالعہ ایک طالب علم سے کچھ زیادہ سنجیدگی بھی نہیں لیکن ان کی سادگی بڑی دلکش ہے حالانکہ کبھی کبھی اس میں سپاٹ پن کا احساس بھی ہوتا ہے اور چند سانٹ معیاری بھی نہیں ہیں لیکن عام طور پر اس سادگی میں بڑی لطافت ہے۔ روانی، تسلسل اور ترنم، جو سانٹ کی صنف کی ضروری خصوصیات ہیں، ان سانٹوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور ان کے استعمال میں صرف اختر شیرانی ہی کو شائق وارثی پر فوقیت حاصل ہے۔ نرم، سبک اور مترنم الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے اور انھیں سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان میں جذبات و محسوسات کی شائستگی کے لطیف مظاہر نظر آتے ہیں۔ اپنے سانٹوں کے متعلق شائق وارثی کی مندرجہ ذیل رائے بڑی جامع اور حقیقت پر مبنی ہے۔

"یہ مجموعہ جس میں الفاظ کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے میرے وجدان و محسوسات کا ایک شیرازہ اور میرے مذاق زندگی اور جذبات کا آئینہ ہے جس کا ہر لفظ میری تصورِ حیات کا ہم رنگ اور جس کی ہر نوا نغمۂ سازِ زندگی کی ہم آہنگ ہے لیکن اس کی کوئی نظم یا کوئی شعر نفسیاتی حرکات کا آئینہ دار نہیں بلکہ مذاق سلیم نے شائستگی جذبات کو حسن الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے" [1]

اس "شاعر فطرت" کی شائستگی جذبات کا یہ حسین گلدستہ اردو شاعری کی محفل میں ایک خوشنما اضافہ ہے جسے نظر انداز کرنا مذاقِ نظر کی توہین ہوگی۔

---

[1] پیش لفظ "نغمات"

▲

مراسلات

بکٹ کہانی کا مصنف

ہماری زبان بابت یکم جولائی ۱۹۸۱ء میں جناب پرکاش مونس کا مضمون "بکٹ کہانی اور افضل" نظر نواز ہوا توجہ فرمائی کے لئے نہایت ممنون ہوں تذکرہ "قائم" میں افضل کے وطن سے متعلق دو مختلف اور متضاد روایتیں ملتی ہیں ان میں سے کسی ایک کی صحت کو تسلیم کرنے کے لئے دوسرے شواہد سے مدد لینی ضروری ہے۔ راقم نے ہماری زبان بابت یکم اپریل ۱۹۸۱ء میں شیخ محمد افضل محقر (جس کا اصل وطن غازی پور تھا) اور شاہ محمد افضل افضل الہ آبادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید ان میں سے کوئی ایک بکٹ کہانی کا مصنف ہو۔ پھر بعض قرائن کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ بکٹ کہانی کا مصنف اول الذکر افضل ہے۔ حال ہی میں استاذ الاساتذہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک نہایت محققانہ مقالہ شائع ہوا ہے اس میں موصوف نے فرمایا ہے:

"افضل تخلص اور محمد افضل نام تھا... ڈاکٹر زور کا قیاس ہے اور میں بھی اس قیاس میں ان کا شریک ہوں کہ یہ مرثیہ شاید اسی افضل کا کہا ہوا ہو جو بکٹ کہانی یا بارہ ماسہ کا مصنف ہونے کی حیثیت سے مشہور ہے مگر وہ افضل الہ آباد کا باشندہ تھا اس لئے اس کو دکنی مرثیہ گویوں میں شمار کرنا صحیح نہیں ہے"

(مراثی ریختہ مشمولہ تحریر دہلی جلد ۵ جزء ۲ صفحہ ۴۰ تا ۴۲)

بکٹ کہانی کا مصنف بہرحال اردو کا شاعر تھا۔ افضل جھنجھانوی یا پانی پتی یا تھانیسری سے منسوب اردو کا کوئی اور کلام اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے اور نہ اس کے لئے کوئی واضح شہادت موجود ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ قائم کے اس قول پر اعتماد کرکے کہ افضل "از سکان دیار مشرق" تھا پروفیسر موصوف کے مذکورہ بیان کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے۔ "بکٹ کہانی" کی زبان بھی اسی قیاس کی موید ہے۔

علی گڑھ ● محمد انصار اللہ

مولانا عبد السلام ندوی کے مکاتیب کی ضرورت

اب سے پندرہ سولہ سال قبل میں نے مولانا عبد السلام ندوی صاحب شعر الہند کی ادبی اور علمی خدمات پر کچھ کام کیا تھا اور اس سلسلہ میں دو خاص نمبر بھی ترتیب دئے تھے۔ پہلا نمبر شبلی کالج میگزین نے شائع کیا تھا جس میں مولانا مرحوم کے تین رفقاء، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبد الرحمٰن اور مولانا سعید انصاری مرحوم کے علاوہ علی حماد عباسی اور میں نے مضامین لکھے تھے۔ اگرچہ یہ نمبر کافی پسند کیا گیا اور اکثر مشاہیر نے اس کام پر میری ستائش کی لیکن میں اس کام سے مطمئن نہ تھا اس لئے دسمبر ۱۹۶۸ء میں میں نے ماہنامہ ادیب علی گڑھ کا عبد السلام نمبر نکالا یہ نمبر میرے ایک طویل مضمون پر مشتمل تھا۔ لکھنے والا اگرچہ انتہائی غیر معروف اور نو آموز تھا لیکن مولانا مرحوم کے نام کی وجہ سے یہ نمبر بھی دیکھتے دیکھتے فروخت ہو گیا اور اب اس کی کوئی بھی کاپی کہیں دستیاب نہیں ہوتی۔ اب پتہ چلا ہے کہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب نے حیات سلیمان کے نام سے جو ضخیم کتاب تحریر فرمائی ہے وہ طباعت کی منزلوں سے گزر رہی ہے اور جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔ اس خبر کو سن کر جی چاہتا ہے کہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم پر پھر سے کچھ کام کیا جائے اور اپنی بساط بھر اس شمع کو روشن رکھنے کی کوشش کی جائے جس کو ۶۵ سال سے ارباب دار المصنفین روشن کئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام جو میرے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے مکاتیب کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جائے۔ اس کے لئے ملک کے بعض مشاہیر نے مولانا مرحوم کے بہت سے خطوط کی نقل مجھے ارسال کر دی ہے۔ اب ہماری زبان کے ذریعہ ملک کے اہل علم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اس کام میں اعانت فرمائیں اور جن حضرات کے پاس مولانا مرحوم کے مکاتیب ہوں وہ ان کی نقل مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرما کر ایک فراموش شدہ ادبی بزرگ کی یاد تازہ رکھنے میں میری مدد فرمائیں۔

علی گڑھ ● کبیر احمد جائسی

عمار منزل، میرس روڈ، علی گڑھ

اردو کے پرانے خادم مولانا خیر بہوروی کا انتقال

لکھنؤ۔ کل ہند غالب اکیڈمی اور میر اکیڈمی کے روح رواں مولانا خیر بہوروی کا ایک طویل علالت کے بعد ان کے آبائی گاؤں بہور ضلع بلیا میں ۱۰ر جولائی کو انتقال ہو گیا۔

گذشتہ دو سال سے ان کو سل کی شکایت تھی اور پیٹ میں پھوڑا ہو گیا تھا۔ مولانا خیر بہوروی نے ۷۰ سال کی عمر پائی وہ مدت تک انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے اور گذشتہ نصف صدی میں اردو کی علمی، ادبی تحریکوں سے ان کو قریبی ربط رہا اور گذشتہ نسل کی اہم ادبی شخصیتوں سے ان کے گہرے تعلقات رہے۔ مولانا کی ادبی خدمات اور میر و غالب پر ان کا کام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ادارہ ان کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

(ادارہ)

اخبار و اذکار

اردو کی ترقی کے لیے حکومت یوپی کا اقدام

لکھنؤ:- وزیر مالیات جناب نرائن دت تیواری نے ریاستی اسمبلی میں اپنی بجٹ تقریر میں یہ کہتے ہوئے کہ ریاست کو اردو زبان پر فخر ہے اردو کی ترقی کے سلسلے میں ایک اکیڈمی قائم کیے جانے کے فیصلے کا اعلان کیا۔

انھوں نے کہا کہ اردو اکیڈمی اردو کتابوں کی اشاعت میں مدد کرے گی اردو مصنفوں کو ایسی کتابوں پر انعام دے گی جو ادب، سائنس اور فن سے متعلق موضوعات پر لکھی گئی ہوں اور ان سے فرقہ وارانہ اتحاد اور قومی یکجہتی کے جذبات پیدا ہوتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اکیڈمی پبلک لائبریریوں اور ریڈنگ روموں کو اردو کی مفید کتابیں اور رسالے خریدنے کے لئے مالی امداد دے گی اور اردو ادیبوں اور مصنفوں کو اپنی تخلیقات شائع کرنے کے واسطے بھی امداد دے گی۔

وزیر مالیات نے بتایا کہ محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کے صدر دفتر میں ایک ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم (اردو) کی تقرری کی جائے گی جن پر اردو تعلیم کا مناسب بندوبست کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔

انھوں نے کہا کہ درجہ اول سے درجہ ۸ تک اردو مضمونوں کے لئے نصاب تعلیم اور درسی کتابوں کے بارے میں صلاح و مشورہ دینے کے لئے ایک بورڈ آف اردو اسٹڈیز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

انھوں نے کہا کہ اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طالب علموں کو اور زیادہ آسانیاں بہم پہنچانے کے پیش نظر حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر کسی اسکول میں اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد ۴۰ یا کسی درجہ میں ۱۰ سے کم ہوگی تو قریب ترین اسکول میں جہاں اردو پڑھانے کا بندوبست ہے ان طلبہ کو داخل کرا دیا جائے۔

جناب تیواری نے کہا کہ گریجویٹ سطح پر کلی اردو کی تعلیم کے بندوبست کے سلسلے میں مزید سہولتیں دینے کے پیش نظر بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفرنگر اور بلند شہر اضلاع میں جہاں اس وقت گریجویٹ سطح پر اردو کی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ ایک ڈگری کالج کو اردو پڑھانے کے لئے پہلے سال سے ہی حسب قاعدہ مالی امداد دی جائے گی۔

رام پور کے سرکاری کالج میں اردو پڑھانے کا بندوبست پہلے سے ہی ہے۔ اب یہ سہولت گیان پور کالج میں بھی فراہم کرنے کی تجویز ہے۔

آگرہ، میرٹھ، کانپور اور گورکھ پور یونیورسٹیوں میں بھی گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ درجات میں اردو کی تعلیم کے بندوبست میں مزید توسیع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ابھی تک اردو گزٹ کی پانچ پانچ کاپیاں صرف ان تحصیل داروں کو بھیجی جاتی ہیں جن کی آبادی کا دس فی صد یا اس سے زیادہ حصہ اردو بولنے والا ہے لیکن اب اردو گزٹ کی نقلیں ریاست کی ہر تحصیل میں مہیا کرنے کے احکام دئے گئے ہیں۔ • قومی آواز

حکومت یوپی کی اردو کے ساتھ ستم ظریفی

لکھنؤ:- بھارتیہ کرانتی دل کے سابق وزیر ریاست رام سنگھ گہنہ نے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے بجٹ میں اردو کو دی جانے والی سہولتوں کو محبان اردو کو گمراہ کرنے کا ایک حربہ قرار دیا ہے۔

اخبار نویسوں سے انھوں نے کہا کہ بجٹ میں اردو کے متعلق جن نام نہاد سہولتوں کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے وہ اتر پردیش کے لاکھوں اردو بولنے والوں کی دیرینہ آرزوؤں اور مطالبات کا ایک جزو بھی پورا نہیں کرتیں۔ بھارتیہ کرانتی دل کے ممبر اسمبلی اور سابق وزیر ریاست جناب حبیب الرحمٰن نعمانی نے کہا کہ بجٹ میں اردو کے لئے جن نام نہاد سہولتوں کا اعلان کیا گیا ہے ان کے ذریعہ محبان اردو کو گمراہ نہیں کیا جا سکتا۔ • سیاست

یوپی میں اردو کے سلسلے میں مسٹر بہوگنا کی بے اطمینانی

دلی:- کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں اردو کے سلسلہ میں جو وعدے کئے تھے ان کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی ہم نے یوپی کے سلسلہ میں کچھ اقدامات کئے ہیں لیکن میں ابھی مطمئن نہیں ہوں یہ بات مرکزی وزیر ڈاک و تار مسٹر ایچ۔ این۔ بہوگنا نے ایک تقریب میں کہی جو اردو ڈائجسٹ محراب کے اجرا کے موقع پر ترتیب دی گئی تھی مسٹر بہوگنا نے جنگ آزادی میں اردو کے اہم رول کا اعتراف کرتے ہوئے اردو کو ہندوستان کی قومی یکجہتی کی علامت قرار دیا اور کہا کہ جو لوگ اردو میں لکھ رہے ہیں وہ ہندوستان کی بڑی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں اور قومی یکجہتی کے کاز میں مدد دے رہے ہیں آپ نے کہا کہ یوپی میں اردو کے سلسلہ میں اور بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے ابھی وہاں بچوں کو جو فارم داخلے میں ملتے ہیں ان میں مادری زبان کا خانہ نہیں ہوتا۔

• الجمعیۃ دلی

حکومت اردو کو اس کا جائز مقام دینے کی خواہشمند

نئی دلی:- وزیر تعلیم جناب سدھارتھ شنکر رائے نے لوک سبھا میں وزارت تعلیم کے بجٹ مطالبات پر بحث کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ حکومت اس بات کی خواہشمند ہے کہ اردو کو اس کا مقام دیا جائے۔ • الجمعیۃ

اردو سے متعلق مجوزہ سہولتوں پر کونسل کے ممبران کا رد عمل

لکھنؤ:- گزشتہ روز یوپی قانون ساز کونسل کے ممبران نے

اتر پردیش کے موجودہ بجٹ میں اردو سے متعلق جو تجویزیں پیش کی گئی ہیں ان پر اپنا ردعمل منفی اور مثبت دونوں طور پر پیش کیا۔

سلطان عالم خاں نے کہا کہ مجھے بڑی خوشی ہے کہ بجٹ میں اردو دوستوں کے جذبات کا احترام کیا گیا ہے حکمراں کانگریس کے ممبر اسمبلی نے یہ بھی کہا کہ مگر ابھی اردو کے لئے مزید سہولتوں کی ضرورت ہے۔

حکمراں کانگریس پارٹی کے وہیپ مسٹر آغا زیدی نے کہا کہ بجٹ میں پہلی بار اردو کے لئے نمایاں سہولتوں کی فراہمی کا اعلان کیا گیا ہے بجٹ میں اردو کے اس مقام کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

تنظیم کانگریس کے ممبر مسٹر شبیر علی صدیقی نے کہا کہ بجٹ میں اردو کی ترویج و اشاعت کی کوئی واضح یقین دہانی فراہم نہیں کی گئی ہے انھوں نے الزام عاید کیا کہ بجٹ میں اردو کا رسمی طور پر ذکر کر کے اردو دوستوں کو بیوقوف بنایا گیا ہے۔

جن سنگھ کے مسٹر پی ڈی کپور نے کہا کہ اردو سے متعلق مجوزہ سہولتوں میں کوئی جدت نہیں ہے یہ نئی بوتل میں پرانی شراب کے مترادف ہے تاکہ مسلم رائے دہندگان کو متاثر کیا جا سکے حکمراں کانگریس کے ممبر جناب مہدی لال ساتھی نے کہا کہ اردو کو ۸ ویں درجہ تک لازمی طور پر پڑھایا جانا چاہئے اور اسے ریاست کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا جانا چاہئے۔

• سیاست

اردو کے ساتھ حکومت آندھرا پردیش کا رویہ حقیقت پسندانہ

حیدر آباد: ڈپٹی چیف منسٹر مسٹر جے وی نرسنگ راؤ نے آصف آباد (ضلع عادل آباد) میں منعقدہ ایک جلسۂ عام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو مسلمانوں ہی کی زبان نہیں بلکہ بلا لحاظ مذہب و ملت یہ زبان سماج کے مختلف طبقات کی جانب سے بولی اور پڑھی جاتی ہے۔ ڈپٹی چیف منسٹر نے مقامی ضلع پریشد اسکول میں اردو جماعتوں کے قیام کے مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک پالیسی مسائل کا تعلق ہے ریاستی حکومت نے اردو زبان کے تعلق سے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اردو زبان کو ممکنہ سہولتیں دے رکھی ہیں۔ ریاستی حکومت اپنی مسلمہ پالیسی کے تحت ضرورت لاحق ہونے پر مرہٹی اور کنڑی زبانوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ انھوں نے مقامی مطالبہ کے تعلق سے صدر ضلع پریشد سے خواہش کی کہ وہ اس کا جائزہ لیں۔ صدر ضلع پریشد عادل آباد نے جلسہ کی صدارت کی۔ ڈپٹی چیف منسٹر نے اردو داں طلبہ خصوصاً مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ ریاستی زبان تلگو بھی سیکھیں۔

• نامہ نگار

یونیورسٹیوں میں ڈگری سطح پر تلگو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ

حیدر آباد: آندھرا پردیش میں تعلیمی سال ۷۱-۱۹۷۰ء سے تینوں یونیورسٹیوں میں ڈگری کورس سطح پر ہیومینٹیز کامرس اور سائنس میں تلگو ذریعہ تعلیم ہوگی۔ تاہم انگریزی کو متبادل ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے جاری رکھا جائے گا۔ اس بارے میں متفقہ طور پر فیصلہ ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں کیا گیا جو چیف منسٹر کی سرکاری قیام گاہ آنند نیلایم میں منعقد ہوا۔ چیف منسٹر جناب کے برہمانند ریڈی نے اجلاس کی صدارت کی۔ اجلاس میں وزیر تعلیم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ سکریٹری محکمہ تعلیم، ناظم تعلیمات آندھرا پردیش، ڈپٹی سکریٹری و ٹیکنیکل بیورو اور عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلروں نے بھی شرکت کی۔ اس فیصلہ کے بموجب عثمانیہ یونیورسٹی کے دائرۂ اثر میں ڈگری سطح پر ہندی اور اردو ذریعہ تعلیم سے متعلق موجودہ سہولتوں کو جاری رکھا جائے گا۔ اس وقت حیدر آباد میں ایک اردو ذریعہ تعلیم اور ایک ہندی ذریعہ تعلیم کے ڈگری کالج ہیں جو دونوں خانگی زیر انتظام ہیں اجلاس کے بعد سرکاری طور پر بتایا گیا کہ تلگو ذریعہ تعلیم کے اہل امیدواروں کو ملازمتوں میں تقررات کے لئے بہتر مواقع فراہم کرنے کے سلسلہ میں ریاستی حکومت عنقریب اپنے پالیسی فیصلہ کا اعلان کرے گی۔ • سیاست حیدر آباد

ادبی سنگم کا ماہانہ مشاعرہ

مورخہ ۱۱ر جولائی کو "ادبی سنگم" بمبئی کی ماہانہ شعری نشست جناب منور آغا مجذوب لکھنوی کی صدارت میں بمقام محبوبی بلڈنگ لیشیا پارک۔ ۔ ۔ ۔ ویسٹ منعقد ہوئی۔ جس میں متعدد شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

• نامہ نگار

بدل کر ایک صحت مند ریاست کے حصول پر مرکوز کی جا سکے۔ ایسی صورت میں خود ریاست انصاف الٰہی کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ ڈرامے میں جگہ جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں، جن میں مذہبی روح کی جھلک پائی جاتی ہے ہیملٹ پنے چچا کو اس وقت جبکہ وہ عبادت میں مصروف ہے قتل کرنے سے صرف اس لئے ابا کرتا ہے کہ اس طرح وہ شہید متصور ہو کر جنت میں داخلے کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اس کے باپ کی روح کو اس بات کا گلہ ہے کہ اسے مروجہ آخری عیسوی (SACRANENTS) کی رسوم سے محروم رکھا گیا۔ گناہ کا احساس اور یہ حقیقت کہ گناہ کی زندگی شخصیت کی اندرونی تہوں کو آہستہ آہستہ گھلا دیتی ہے ڈرامے میں شروع سے آخیر تک موجود ہے۔ اسی طرح روح کی لافانیت کا تصور اور کفارے (ATONEMENT) کا تصور بھی بہت اہم ہیں۔ روح کا عالم سفلی سے عالم بالا کی طرف سفر فرشتوں کی معیت میں دکھلایا گیا ہے اور ڈرامے کے آخری حصے میں تو خدا کی خدائی (PROVIDENCE) میں یقین اتنا واضح ہے کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا موت تو حرم ہے ہی لیکن اس سے زیادہ قوی یہ احساس ہے کہ انسان کے عزائم اور ولولے سب مشیت خداوندی کے تابع ہیں۔ اور انسان کو ہر بات کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس یقین اور عقیدے سے جس سکون اور عافیت کا احساس پیدا ہوتا ہے وہ پورے ڈرامے کی تلخی غیر یقینی اور عدم استقامت کو اس سے متضاد کیفیتوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اسی قبیل کے دوسرے ڈرامے MEASURE FOR MEASURE کا تو عنوان ہی میتھیو (MATTHEW) کے ساتویں باب سے لیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی بنیاد جس کشمکش پر ہے وہ عدل و انصاف اور محبت آمیز فراخدلی (CHARITY) کے مابین ہے۔ اور آخر میں جیت اس آخری جذبے ہی کی ہوتی ہے۔ اس ڈرامے میں جو اصل مسئلہ ہے یعنی یہ کہ ہیروئن ایسابیلا اپنی عصمت کی قیمت ادا کر کے اپنے عزیز اور محبوب بھائی کی جان بچائے یا نہ بچائے۔ اس کے بارے میں دو مختلف رائیں پیش کی گئی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ایسابیلا اور اینجلو، دونوں کے موقف کی حمایت اور مخالفت میں کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایسابیلا عفو و درگذر اور فراخدلی کی جو اپیل اینجلو سے کرتی ہے اور جسے وہ مسترد کر دیتا ہے، اسے وہ حضرت عیسیٰ کے عمل سے محکم کرتی ہے اور خدا کا اپنے بندوں سے رحم آمیز برتاؤ کا واسطہ دیتی ہے جس کے بغیر ہم میں سے کسی کی نجات ممکن نہیں۔ دونوں کے موقف کی تنقید کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک طرف اینجلو سخت گیر اور بے لچک قانون کی آڑ لیتا ہے تو دوسری طرف ایسابیلا کی اپنی عفت و عصمت کی پاسداری میں ایک طرح کی خود بینی اور رعونت پائی جاتی ہے۔ لیکن پایانِ کار ایسا لگتا ہے کہ دنیا کے پیچیدہ نظم میں انصاف اور رحم دونوں کے لئے جگہ ہے۔ گو اس نقطۂ نظر کو اپنانے کے لئے جس بصیرت درکار ہے، جیسے ڈیوک کی شخصیت کے ذریعہ آشکار کیا گیا ہے۔ اس شخصیت کا ایک عام حقیقی کردار کی طرح مطالعہ یا احاطہ کرنا فریب کن نتائج تک لے جا سکتا ہے، کیونکہ وہ دراصل ایک اشاریہ ہے ایک مابعد الطبیعاتی قوت کا، جس کے ذریعے دونوں مرکزی کردار ایک طرح کی تادیب و تہذیب کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اس پورے ڈرامے میں گناہ یا داشِ گناہ ندامت اور اس کے ماحصل کے سلسلے میں نقطۂ نظر سراسر عیسوی ہے۔ اور اس میں مرحمت و سعادت کا رمز نہ صرف کلیدی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اسی کی نسبت سے دونوں کرداروں کے نقطۂ نظر کی محدودیت ہم پر ظاہر ہوتی ہے۔

ان سب ڈراموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جن کا ذکر ابھی کیا گیا اگر ہم ان تین ڈراموں یعنی THE WINTER'S TALE (CYMBELINE) اور THE TENPEST کا تصور کریں جنھیں عام طور پر "رومانوی" سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو ہم محسوس کریں گے کہ یہاں عیسوی اخلاقیات کے وہ تمام عناصر، جو اخیر اور مابعد الطبیعاتی پردوں میں چھپے ہوئے تھے، خاصے نمایاں ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ ان میں اخلاقی اصول یا نکات کا براہ راست پرچار کیا گیا ہے یا روایتی مذہب کی (COSMOLOGY) پیش کی گئی ہے، لیکن ان میں ڈرامہ نگار کا مذہبی ادراک اور زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان تینوں ڈراموں میں ایک ہلکا سا عنصر رومان کا ہے اگر یہ غالب یا مرکزی عنصر ہرگز نہیں ہے۔ نہ یہاں اس مثالی (UTOPIAN) دنیا کی جھلکیاں دکھانا مقصود ہے جو انگریزی ادب میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ یہاں بھی اور ڈراموں کی طرح اس شر کو جو انسان کے ضمیر میں پیوست ہے، واضح طور سے سامنے لایا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی عیسوی اخلاقیات کے اس اصول کی کارفرمائی بھی ملتی ہے کہ انسان کچھ کھو کر ہی کچھ حاصل کرتا ہے، یا کچھ حاصل کرنے کے لئے کچھ کھونا بھی ضروری ہے یہاں بھی خیر اور شر کی آویزش نظر آتی ہے، لیکن یہ آویزش انتشار کی شکل میں نہیں بلکہ بازیافت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کنگ لیر میں عفو و درگذر کا جو عنصر ہے، اوتھیلو اور ہیملٹ میں ندامت کا جو عنصر ہے MEASURE FOR MEASURE میں رحمت (GRACE) کا جو عنصر ہے وہ سب یہاں یکجا ہو گئے ہیں۔ یہاں نو خیز نسل کے تعلقات میں رومان کا عنصر گویا وہ واسطہ ہے جس کے ذریعے والدین کے درمیان مفاہمت و مصالحت کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ ایل۔ سی۔ نائٹس نے شیکسپیئر کے بارے میں یہ بات بہت صحیح کہی ہے کہ اس کے

[illegible]

اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوسرے المیہ ڈرامے (MACBETH) میں داخل جہنم ہونے کی کیفیت (DAMNATION) جتنی واضح ہے اس سے کم واضح مرحمت (GRACE) کا تصور نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس پہلو پر پوری طرح زور نہیں دیا گیا۔ خیر و شر کے درمیان کشمکش کی جولانگاہ یوں تو مرکزی کردار میکبتھ کا قلب اور روح ہیں لیکن یہ تضاد پورے ڈرامے میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ بظاہر ڈرامہ نگار کا سروکار مابعد الطبیعاتی شر سے معلوم ہوتا ہے، جس میں مرکزی کرداروں کی روحیں پورے طور پر ملوث ہیں لیکن مرحمت کے تصور کے بھرپور نمائندے (DUNCAN) اور (MALCOLM) ہیں۔ مرکزی کرداروں کا سب سے بڑا گناہ اس فطری اور انسانی نظم کو درہم برہم کرنا ہے، جس سے تمام رشتوں اور رابطوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے محبت کا اصول بھی کہہ سکتے ہیں، یہی اصول جب میکبتھ اور لیڈی میکبتھ کے نفرت کے جذبے کے خلاف اپنے ادعا پر مصر ہوتا ہے تو ہم تخریب سے تعمیر اور اضمحلال و انتشار سے خیر اور ترتیب نو کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہاں کسی طرح بھی مذہبی قانون کی ترجمانی نہیں کی گئی ہے لیکن داخل جہنم ہونے (DAMNATION) کا تصور بھی مذہبی ہے اور روح کی تطہیر اور بازیافت کا تصور بھی۔ اس ڈرامے میں بنیادی عنصر بادشاہت حاصل کرنے کا ولولہ اور اس کے لئے ناجائز وسائل اختیار کرنا نہیں ہیں، بلکہ یہ حقیقت کہ انسان اپنے اعمال سے اپنی جنت اور دوزخ تعمیر کرتا ہے اور اس کی روح برابر ذلالت اور گمراہی اور مرحمت و سعادت کے درمیان معلق رہتی ہے۔

تیسرے معروف المیہ ڈرامے اوتھیلو (OTHELLO) کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ یہ ایک محدود قسم کا خانگی المیہ ہے۔ گو اس ڈرامے میں ہم شیکسپیئر کے عظیم اور لافانی کرداروں میں سے ایک یعنی ایاگو (IAGO) کے کردار سے دوچار ہوتے ہیں یہاں اوتھیلو اور اس کی بیوی (DESDEMONA) دونوں اپنے اپنے طور پر معصومیت کے علامیہ ہیں اور یہ معصومیت برابر اس شر کی زد میں رہتی ہے جو ایاگو کی شخصیت میں متشکل کیا گیا ہے۔ ایاگو شر محض کا اشاریہ ہے اور اس کے ورغلانے کے نتیجے کے طور پر اوتھیلو نہ صرف اپنی ذہنی عافیت اور سکون کو خطرے میں ڈالتا ہے، بلکہ برابر اپنے لئے روحانی جہنم کی تعمیر کرتا رہتا ہے۔ ڈرامے میں بہشت اور دوزخ کے کلیدی الفاظ تواتر کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح شیطان اور فرشتوں کے استعارے بھی برابر ملتے ہیں۔ یہاں بھی مرحمت اور سعادت کا تصور بہت اہم ہے، اور مرکزی کردار ڈیسڈی مونہ کی شخصیت میں اس کا اشارہ ملتا ہے۔ اوتھیلو اپنی بیوی کے قتل کے بعد جب اپنا محاسبۂ نفس کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی روح کو ایک بے آب ہیرے کی طرح غلاظت کے ڈھیر میں پھینک دیا ہے، بالکل اسی طرح جیسے میکبتھ کا یکے بعد دیگرے کئی قتل کرنا اس کے سقوط جہنم کے مترادف ہے۔

دو مسائلی (PROBLEM) ڈراموں یعنی ہیملٹ اور (MEASURE FOR MEASURE) میں یہ مذہبی عنصر اور زیادہ واضح طور سے سامنے آتا ہے۔ ہیملٹ کا بیرونی ڈھانچہ [illegible] کے ڈھانچے سے مختلف ہے۔ ہیملٹ کے باپ کا آسیب ایک ایسی روح ہے، جو تطہیر کے عمل کے بعد عالم برزخ سے اس دنیا میں آئی ہے۔ بیشک وہ ہیملٹ کو اس کے حکمران چچا کے قتل پر جس طرح اکساتی ہے، وہ بظاہر عیسوی اخلاقیات کے منافی ہے۔ لیکن ایک طرف تو ڈرامے میں ایسے اشارے موجود ہیں کہ ہیملٹ اپنے چچا کے قتل کا ارادہ محض ذاتی عناد کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ ڈنمارک کی ریاست کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک کرنے اور مجموعی طور پر حالات کو روبہ اصلاح لانے کے خیال سے۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ آسیب کا اصرار برابر اس امر پر ہے کہ ہیملٹ قتل کا منصوبہ بناتے وقت اپنے ذہن اور روح کو جذبۂ انتقام اور دوسرے سفلی جذبات سے ملوث نہ ہونے دے۔ تیسرے آخر آخر میں ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ بادشاہ کی شخصیت میں رفتہ رفتہ ایک نامعلوم تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ شروع میں وہ ایک فعال "چست" زیرک اور معاملہ فہم فرمانروا نظر آتا ہے اور شاید ہیملٹ کی طرف بھی اس کا رویہ کلیتہً معاندانہ نہیں لیکن رفتہ رفتہ شکست اس پر پوری طرح سے غالب آجاتی ہے۔ اور وہ مکر و فن کے ہر ہتھیار سے اپنے آپ کو آراستہ کر لیتا ہے اور اسی طرح زیادہ سے زیادہ اس کا جواز پیدا ہو جاتا ہے کہ قتل کے معاملے میں ہیملٹ کا عمل سزا کا نہ معلوم ہونے کی بجائے تزکیے کا عمل معلوم ہو۔ اور اس طرح قتل کی بنیاد ذاتی عناد سے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922 فون نمبر 29 R. No. 2196/57